

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ کے مشہور وکیل مولوی شیخ حبیب اللہ کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش مئی 1857ء مطابق ذی قعدہ 1274ھ کو ہندول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ مولوی شکر اللہ سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد غازی پور گئے۔ وہاں مستند استاد مولانا محمد فاروق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مولانا ہی نے شبلی کے ساتھ نعمانی کا لفظ بڑھا دیا۔ رام پور میں انہوں نے فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ وہاں سے لاہور چلے گئے جہاں ان کو مولانا فیض الحسن پروفیسر اور نیشنل کالج جیسا استاد مل گیا۔ عربی ادب کی تکمیل انہوں نے وہاں کی اور پھر سہارن پور میں مولانا احمد علی سے کتب حدیث کا درس لیا۔

شبلی کے والد چونکہ ایک کامیاب وکیل تھے اور ان کے استاد مولانا محمد فاروق بھی وکیل تھے، والد بزرگوار نے وکالت پاس کرنے کو کہا۔ شبلی نے والد کے حکم کی تعمیل میں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ لیکن اس پیشہ میں اہل حلال کار دروازہ انہیں بند محسوس ہوا۔ اس لیے اس سے الگ ہو گئے۔

1882ء میں شبلی علی گڑھ گئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی۔ بتاواں خیال ہوا۔ ہم مزاجی محسوس ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ حسن اتفاق کہ ان دنوں علی گڑھ کالج میں ایک عہدہ پروفیسر کا خالی تھا۔ سرسید نے انہیں چالیس روپے ماہوار پر مقرر کر لیا۔ سرسید شبلی کی صلاحیتوں کے معترف ہوتے گئے۔ سرسید نے اپنا پورا کتب خانہ شبلی کو مطالعہ کے لیے وقف کر دیا۔ شبلی 1892ء میں فلسطینیہ پہنچے اور چند مہینوں تک بلا واسلامیہ کا سفر کرتے رہے۔ 1894ء میں انہیں سلطنت ہند کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

سرسید کے انتقال کے بعد 1898ء میں شبلی مستعفی ہو کر اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے نیشنل اسکول قائم کیا۔ پھر وہ حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدہ پر چار سال تک کام کرتے رہے۔ انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی تو شبلی اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ شبلی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بھی ناظم مقرر ہوئے لیکن 1913ء میں اس سے بھی الگ ہو گئے۔ پھر اعظم گڑھ منتقل ہو گئے اور یہاں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس قومی خدمت کے لیے اپنا بارغ، اپنا مکان اور کتب خانہ وقف کر دیا۔ یہ ادارہ تحقیق و تصنیف کا کام کرتا رہا۔ علامہ شبلی کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑے ہی احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں شعر العجم، الفاروق، سیرۃ النبیؐ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ 57 سال کی عمر میں 18 دسمبر 1914ء بمطابق 28 ربیع الثانی 1332ھ روز چہار شنبہ کو علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا۔

تعلیم قدیم و جدید

کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے؟ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

اگرچہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں۔ لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی اور دینی درس گاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں۔ ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے وہ اس پر قانع تھیں۔ اس لیے ان مسائل کو حل کرنے کی ان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں۔ ہر سال سیکڑوں ایم۔ اے اور بی۔ اے ہو کر نکلتے ہیں۔ سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں۔ سیکڑوں وکالت کر رہے ہیں۔ سیکڑوں انجمنیں اور امیدوار ہیں۔ ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مولوی تیار ہو گئے ہیں۔ ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے۔ ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے کیوں کہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابلی مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے اعلانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد مل

سکتی ہے۔ لیکن واقعی اب اس کا وقت آگیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کر دے جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں اور مجوزہ نقشہ ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تاکہ جو کام ہو رہے ہیں، سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے ورنہ دوطرفہ کشمکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں؟

اس غرض سے سوالات ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڑھ دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کس کے حد عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعتاً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ان کو ذرا غور سے کام

لینا چاہئے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے، لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں۔ کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں، ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقہ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں، ایک معرکہ کا سوال ہے۔ نہ اس لئے کہ درحقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لیے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قائم ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں۔ اس لئے ان کو اعلانیہ نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟ اس لئے پہلے ہم انھیں سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے۔ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ

اس ضرورت کی مقدار کیا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات، یعنی امامت، وعظ، افتاء کا کام لینا نہیں ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ اس کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلہ کتب دینیات کی ضرورت ہے۔ جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کی قابل ذکر کتابیں ہوں۔ اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں بننا ہوگی ہیں۔ ان کا ترجمہ کافی ہوگا۔ عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے، کیوں کہ ہندوستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف نا کافی اور ناقابل درس ہیں۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تفسیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہو سکتا۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف، مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔ دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔ مذہبی علماء پیش قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں۔ وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکان کالج تمام امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گراں بہا وظائف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ درجہ کی مذہبی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں۔ اس لیے ہم ان سے سوالات ذیل کے جواب چاہتے ہیں:

۱۔ یورپ کے مصنفین، مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

۴۔ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیوں کر دے سکیں گے؟

۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیئے تھے؟

۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے؟

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علما کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے اصلاح پر مجبور کریں۔ اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لیے ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت اور احترام کرنا چاہیے۔ اس نقطہ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بیکار بناتے ہیں۔ وہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ صرف ہم کو اس کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہیے۔ البتہ اس قسم کے قدیم مدرسوں میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہیے جس سے تعصب، سخت دلی تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کر سکتے اور ہر موقع پر دونوں دوسریف کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو دربار نبوی کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہیے جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار مالتا تھا اور ان کی بھی خاطر داری کی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ قبول لاہد ولا لینا یعنی

فرعون سے نرمی سے بات کرنا۔

دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہیں۔ اس لیے دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہیے۔ لیکن علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا۔ ہے اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے اور جو عملی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے تو آج کل قوم کی کوششوں کی پراگندگی کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود میں محدود رہ کر اپنے کاموں کو انجام دیں۔

لفظ و معنی

جنبش	-	حرکت
حریف	-	مخالف
مجزوہ نقشہ	-	تجزیہ کیا ہوا نقشہ
اعتراضات	-	اعتراض کی جمع
تصانیف	-	تصنیف کی جمع

آپ نے پڑھا

□ مولانا شبلی نے تعلیم کے قدیم اور جدید تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے دونوں کے فوائد پر تفصیل سے اور مثالوں کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔

□ مولانا کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم کے ساتھ جدید طرز کی تعلیم سے بھی واقف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے مذہب سے بھی آگاہ رہیں اور بدلتے ہوئے رجحانات پر بھی ان کی نظر رہے۔

□ مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ مدرسوں میں اس طرح کی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے تعصب اور تنگ خیالی پیدا نہ ہو۔

آپ بتائیے

1. علامہ شبلی کہاں پیدا ہوئے؟

2. ان کی کسی ایک تصنیف کا نام بتائیے۔
3. علامہ شبلی کیا کبھی انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے؟
4. کیا علامہ شبلی ندوۃ العلماء میں بھی رہے؟
5. دارالمصنفین کو کس نے قائم کیا؟

مختصر گفتگو

1. جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟
2. قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟
3. دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟
4. کیا ان دونوں میں ٹکراؤ ہے؟
5. علامہ شبلی کو ٹکس العلماء کا خطاب کب ملا؟

تفصیلی گفتگو

1. تعلیم قدیم و جدید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. علامہ شبلی نے دونوں طرح کی تعلیم کے دائرہ کار کو کس طرح متعین کیا ہے؟
3. علامہ شبلی نے قدیم و جدید تعلیم میں اصلاح کی کیا تجویزیں پیش کی ہیں؟
4. ایک مضمون لکھ کر علامہ شبلی کے خیالات و کارناموں کو واضح کیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. علامہ شبلی کی کوئی ایک تصنیف جو آپ کو پسند ہو اپنے سامنے رکھ کر اس کے اہم نکات لکھیے۔
2. تعلیم قدیم و جدید کے مضمون سے جو پیغام ملتا ہے، اس کو عام کرنے کی کوشش کیجیے۔
3. اس فکر کو عام کیجیے کہ تعلیم قدیم و جدید دونوں فائدہ مند ہے اور اسے حاصل کرنا چاہیے۔

ترجمہ نگاری

اردو ادب کے مجموعی ارتقاء میں ترجمہ نگاری کا اہم کردار رہا ہے۔ چنانچہ اردو افسانہ، ڈراما اور آزاد نظم کے ارتقا میں بھی تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بہتر ترجمہ کرنے کے لیے اصل تخلیق کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاہم اس سلسلے میں شاعری اور انشائیہ کے مقابلے میں افسانہ اور ڈرامہ کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔

اردو ادب میں غیر ملکی ادب کے تراجم کی کہانی بہت قدیم ہے۔ خاص طور سے نورث ولیم کالج کا رول ترجمہ کے معاملے میں تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ پھر بیسویں صدی میں انگریزی، روسی اور ترکی ادبیات سے بھی اردو میں ترجمہ کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں جیسے بنگلہ، مراٹھی، گجراتی اور پنجابی وغیرہ سے بھی اردو میں ترجمہ کیا جانے لگا جس سے دوہری سطح پر ترجمہ کا رجحان بڑھتا چلا گیا۔ مغربی ادبیات کے تراجم کی وجہ سے ہمارے اردو افسانہ کے سرمائے میں کافی اضافہ ہوا۔

ترجمے کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اولاً آزاد ترجمہ، دوسرے لفظی یا با محاورہ ترجمہ۔ آزاد ترجمہ کے مقابلے لفظی ترجمہ زیادہ کار آمد اور اصل تخلیق کی ترسیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک ملک کی زبان میں لکھی گئی کسی تخلیق کو کسی دوسرے ملک کی زبان میں ترجمہ کرنا ایک دشوار کام ہے کیونکہ تخلیق کا رشتہ اپنی زبان سے بہت مضبوط ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اچھے سے اچھا ترجمہ بھی صد فی صد کامیاب نہیں ہو سکتا۔



مغربی انشائیے

لفظ ایسے (Essay) فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) سے انگریزی زبان میں آیا۔ اس کا لغوی مفہوم ہے 'کوشش'۔ انشائیہ انگریزی زبان میں ایک قابل قدر صنف ادب ہے اس میں مقالہ یا مفہوم کی صورت میں شخصی تاثرات، جذبات یا فلسفیانہ و حکیمانہ تفکرات کو پیش کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے پرسنل ایسے (Essay) یا ایک نازک صنف مانا جاتا ہے۔

انگریزی میں انشائیہ فرانسیسی زبان سے آیا ہے۔ کہتے ہیں سولہویں صدی میں ایک فرانسیسی ادیب مائیکل ڈی مونٹین نے اس فن ادب کی داغ بیل رکھی۔ ان دنوں انشائیہ کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ پرانے روم اور یونان کی عالی مرتبہ شخصیات کی زندگیوں کے کسی پہلو یا گوشہ پر اس طرز سے لکھا جاتا کہ اس سے کچھ نہ کچھ اخلاقی درس حاصل ہو۔ ان دنوں کے انشائیوں میں مثبت قدروں یعنی دانائی، ایمانداری، بہادری کو نفس مضمون بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں مونٹین نے روایتی طرز پر کچھ انشائیے لکھے۔ لیکن بعد میں اس نے اپنی تحریر میں خاصی آزادی حاصل کر لی۔ کہتے ہیں مونٹین جو کچھ اپنے ماحول میں دیکھتا یا جس موضوع پر غور و خوض کرتا، اس پر آزادی سے مقالے لکھتا۔ اس نے مختلف موضوعات پر ہلکے پھلکے اور فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات کو ایک باربط اور ایک ادبی زبان میں پیش کیا۔ مونٹین نے اپنے انشائیوں کے نقش اول پر یوں لکھا ہے:

’میں نے ان انشائیوں میں اپنے آپ کو منعکس کیا ہے‘

مونٹین کے زمانہ سے پہلے انگریزی میں انشائیے نام کی کوئی صنف موجود نہ تھی۔ چنانچہ جان فلوریو (John Florio) نے پہلی بار فرانسیسی انشائیوں کے ترجمے کر کے انگریزی داں طبقے کو روشناس کرایا۔

سترہویں صدی میں فرانسیسی بیکن (1561-1626ء) نے انگریزی زبان میں اٹھاون انشائیے 1597ء سے 1625ء کے درمیان لکھے۔ آج بھی ان انشائیوں کو انگریزی ادب میں بلند مقام حاصل ہے بلکہ ان میں چند انشائیے تو ادبی شہ پارے بن چکے ہیں۔ بیکن کے انشائیوں میں غزل کے اشعار کی طرح زور بیان، اختصار اور محاورہ

کا بیان ہے۔ کئی جملے تو ضرب المثل معلوم ہوتے ہیں۔ ان انشائیوں میں تنقید حیات ہے۔ کچھ تکلف اور غور و فکر کی گہرائی بھی ان میں فلسفیانہ عنصر بھی ہے اور کچھ رومانیت بھی۔ لیکن کے الفاظ میں انشائیہ ایسی مختصر تحریر ہے جس میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی حقیقت کا اظہار ہو جائے۔ لیکن کے ایک انشائیے 'آف اسٹڈیز' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

مطالعہ خوشی بکھیرتا ہے۔ یہ شخصیت میں آرائش کا سامان بنتا ہے اور قابلیت بڑھاتا ہے اگر آپ فراغت میں ہوں تو خوشی آپ کے دامن میں رہے گی۔ گفتگو میں مطالعہ سے حاصل کی ہوئی قابلیت آپ کے فیصلوں اور کاروباری مسائل میں آپ کی معاون ہوگی۔

اسی انشائیے میں آگے چل کر فرماتے ہیں :

'کئی کتابوں کا محض ذائقہ لینا ہی کافی ہے۔ کئی کتابوں کو خوب نگلنا ہوتا ہے اور کچھ کو خوب چبا کر کھانا اور ہضم کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ ایک انسان کو انسان سے مکمل انسان بنادیتا ہے۔ گفتگو سے انسان کا ادراک کچھ قوی ہو جاتا ہے اور تحریر سے انسان ایک متوازی انسان بن جاتا ہے۔'

اس صدی میں ایک انشائیہ نگار جان ارل اور اس کے ایک معاصر ٹامس اور ہری نے اپنے دور کی عورتوں، مردوں کے کرواروں کا اپنے انشائیوں میں تجزیہ کیا ہے۔ ان دونوں ادیبوں نے ڈیری فارم میں کام کرنے والی عورتوں سے لے کر بلند مرتبہ سیاست دانوں تک کی کردار نگاری کی اور انسانی فطرت کے گونا گوں پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ جان ارل کا انشائیہ مائیکرو کاسموگرافی طنز و مزاح کا ایک نادر نمونہ ہے۔

سر رچرڈ اسٹیل ایک خالص ادبی فہم و فکر کا مالک تھا۔ اس نے کئی نظمیں، کامیڈیاں اور سیاسی اور صحافتی نگارشات پر طبع آزمائی کی لیکن اس نے سب سے زیادہ نام The Tatler نام کے رسالے سے پیدا کیا۔ اس ادبی کام میں ایڈیٹر اس کا قابل قدر رفیق و معاون رہا۔

ان رسائل میں رموز حیات پر فلسفیانہ رنگ میں افکار پریشاں شائع ہوتے تھے۔ ان دنوں صرف لندن میں ہی لگ بھگ ساٹھ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ جن میں ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر انشائیے شائع

ہوتے تھے۔ ان اخبارات اور رسائل نے انشائیوں کو ایک ہر دل عزیز صنف بنا دیا۔ اسٹیل (Steel) اخلاقی اوصاف اور انسانی صفات کو انسان کی سرشت میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہ اپنے وقت کے معاشرے کی خرابیوں اور بے اعتدالیوں کی طرف اٹھتی رہی اور اس کے انشائیوں کا مواد فراہم کرتی رہی۔

اٹھارہویں صدی کے انشائیہ نگاروں پر آلیور گولڈ اسمتھ کا نام ممتاز ہے۔ اس کے انشائیوں میں ایک ہلکا سا مزاح جھلکتا ہے۔ زبان کی چاشنی اور خیالات کی تازگی اس کے انشائیوں کی جان ہے۔ ہیمونیل جانسن کے انشائیوں میں تکلف کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اس کا اسٹائل بھی ایک حد تک لاطینی رہا۔ جانسن کبھی کبھار انشائیے لکھتا تھا۔ اس کے انشائیے تنہائی کے حق میں اور اچھا مزاح اس کے شاہکار کہے جاسکتے ہیں۔

(Charles Lamb) چارلس لمب کو انگریزی انشائیوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ ان میں اس کا نرم و لطیف دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ لمب زیادہ تر اپنی زندگی سے ابھرتے موضوعات پر انشا پرداز کرتے ہیں۔ ایلیا کا انشائیہ اس کی سوانح حیات کا مظہر ہے۔ اس کے انشائیوں میں دانش وری، فلسفہ اور انسانیت کا عنصر ہے۔ کہیں کہیں لمب سترہویں صدی کے انشائیہ نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ چارلس لمب نے انگریزی انشائیوں میں لطافت بیان اور حیات و کائنات پر بھرپور تنقید کی ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں جان رسکن اور ٹامس کارلائل نے کچھ انشائیے لکھے۔ رسکن کے انشائیوں میں فطرت سے لگاؤ، خلوص، سادگی اور بیان کی دل کشی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کا ایک انشائیہ گھاس کا ایک پاتہ بین الاقوامی شہرت کا درجہ لے پایا۔ یہ پاتہ ایک زرد رنگ کا اندر سے کھوکھلا ڈنٹھل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں سوچیں، اور فیصلہ کریں کہ وہ تمام چمکدار پھول جو موسم گرما کی فضا میں دیکھتے ہیں اور وہ تمام تنومند اور خوش اندام شجر جو آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ مثلاً سرو قد ہام اور صنوبر اور شاہ بلوط خوشبودار گلگل اور لدی پھندی انگور کی پیل۔ کیا ان میں کوئی ایسا بھی ہے جس سے انسان نے اتنی محبت اور خدا نے جس کی اتنی قدر کی ہو جس گھاس کے پاتہ کی، میتھو آرنلڈ (Methew Arnlald) نے تنقیدی انشائیے لکھے، جن میں استدلال اور جدت غالب ہے۔ اس کے انشائیے اختصار اور جامعیت کے بہترین نمونے ہیں۔

ایک ہم عصر ناول نگار نے کسی بدیشی سے ایک بار یہ سوال کیا تھا کہ انگلستان کی اہم ترین فصلیں کون سی ہیں تو اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا تھا 'رائی' جہالت اتنی مکمل تھی کہ مجھے پون محسوس ہوا جیسے اس نے عظمت

چھوٹا ہو لیکن جاہل آدمی کی لاعلمی تو اس سے کہیں افزوں ہوتی ہے۔ ایک اوسط ذہن کا آدمی جو ٹیلی فون کو استعمال کرتا ہے اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتا کہ ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے۔ وہ ٹیلی فون کو بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ وہ انجیل مقدس کے معجزوں کو بغیر کسی ثبوت کے بہ رضا و رغبت مان لیتا ہے۔ وہ نہ اس کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور نہ ہی اس کے سلسلے میں سوچ بوجھ رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں ٹی۔ ایس۔ ایلٹ جو نوبل انعام یافتہ اور جدید شاعری و تنقید کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔ چند ادبی و تنقیدی انشائیوں کے مصنف بھی ہیں۔ ایک انشائیے روایت اور انفرادی ملکہ میں فرماتے ہیں:

’شاعری جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جذبات سے فرار ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار بھی نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے۔‘

ایلٹ نے مزید انشائیے عہد الزا بیچہ کے ڈرامہ نگاروں (جائن و ملڈ لیٹن) پر لکھے۔ کچھ انشائیے ’کلاسیکی کیا ہے؟‘، ’مذہب اور ادب‘، ’تجربہ اور تنقید‘، تنقید کی حدود اور ’شاعری کا سماجی منصب‘ قابل ذکر ہیں۔ ایلٹ نے انشائیوں کے ذریعہ انگریزی ادب کے قدروں کو نئی تراکیب و اہمیت کے ساتھ متعین کیا ہے اور انگریزی ادب کا یورپی اقدار۔ آج کا انشائیہ نگار کوئی نئی بات کہنے کا عادی ہی نہیں رہا۔ پرانی باتوں اور مطبوعہ خیالات و تاثرات کو توڑ مروڑ کر پیش کر پاتا ہے بلکہ کہی ہوئی باتیں دہراتا ہے۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف انشائیہ نگاروں نے مختلف اسٹائل سے ادا کیا ہے۔ اسے انشائیہ نگاری نہیں کہتے۔ پروکٹر، لی ہینٹ، چارلس لیمب اسی قماش کے انشائیہ نگار کہے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر لیمب مردے کی ارتھی پر بھی مزاح نگاری پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ انشائیہ نگاری سے کوسوں دور چلا جاتا تھا۔

انشائیہ نگاری ایک ہنس پر پھول مالا میں سجا کر رقص کرنے کا کام نہیں۔
 یہ کڑی محنت کا طلب گار ہوتا ہے۔ ساتویں دن اور چوبیس گھنٹے انشائیہ
 نگار سرگرم کرے اور بغیر ستائے لکھتا رہے تو بات بنتی ہے۔ قلم برداشتہ
 لکھے یا ادھر ادھر کی ہانکنے کو انشائیہ نگاری نہیں کہتے۔ یہ کالم بنجیدگی، گہری
 سوچ اور متانت کا متقاضی ہوتا ہے۔

یہ ایک سنجیدہ انشائیہ نگار کی رائے ہے جو ہر فرد بشر کو قابل قبول ہوگی۔

لفظ	-	لفظ سے متعلق
مفہوم	-	مطلب
صنف	-	قسم (جواب کی قسموں کے لیے عموماً بولا جاتا ہے)
تاثر	-	اثر قبول کرنا
حکیمانہ	-	حکمت سے بھری ہوئی
پرست	-	ذاتی
انشائیہ نگار	-	انشائیہ لکھنے والا
فلسف	-	فلسفہ کا علم رکھنے والا
نقاد	-	تنقید کرنے والا
مقالہ نگار	-	مقالہ لکھنے والا
اسلوب	-	لکھنے کا طرز
طویل	-	لمبا
لب و لہجہ	-	انداز، لکھنے کا طریقہ
سبک	-	ہلکا
جذباتی	-	جذبات سے بھرا ہوا
طنزیہ	-	طنز سے بھرا ہوا
رمزیہ	-	رمز سے بھرا ہوا
دانائی	-	عقل و دانش
تنقید	-	کھرے کھوٹے کی پرکھ
عنصر	-	حصہ
آرائش	-	سجاوٹ
معاون	-	مددگار

مضمون	-	صرف
مضمون کرنا	-	پہچانا
ادراک	-	سمجھ
قوی	-	طاقت ور
متوازی	-	برابر میں، مقابلے میں
صدی	-	سوسال کی مدت
فہم	-	سمجھ
آپ نے پڑھا		

- انشائیہ ایک نثری صنف ہے جس میں طنز و مزاح کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔
- اردو میں انشائیہ انگریزی انشائیہ کے حوالے سے داخل ہوا۔
- دیگر اصناف نثر کی طرح انشائیہ نسبتاً جدید صنف ہے۔
- زیر نصاب مضمون میں اندر رجیت لال نے مغربی انشائیوں پر تنقید کی ہے۔
- سلیم آغا قزلباش نے اس تنقیدی مضمون کو اردو کا جامہ پہنایا ہے جس کی مدد سے اردو انشائیوں کے حدود و خال متعین کرنا آسان ہے۔

آپ بتائیے

1. زیر نصاب مضمون 'مغربی انشائے' کس قسم کا مضمون ہے؟
2. مضمون 'مغربی انشائے' کے اصل مضمون نگار کون ہیں؟
3. 'مغربی انشائے' مضمون کا ترجمہ کس نے کیا؟

مختصر جواب لکھو

1. تنقید کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
2. اردو انشائیہ کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔
3. ترجمہ نگاری کے فن کو مختصراً بیان کیجیے۔

تفصیلی گزشتہ

1. ترجمہ نگاری کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

2. صنف انشائیہ پر روشنی ڈالیے۔

3. 'مغربی انشائے' کا جائزہ لیجیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. کلاس میں اردو اساتذہ سے انشائیہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجیے۔

2. کسی لائبریری میں جا کر اردو ترجمہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

سفر نامہ

عام بول چال کی زبان میں سفر کے حالات کو تحریری شکل میں لکھنے کو سفر نامہ کہتے ہیں۔ سفر نامے کا شمار اردو نثر کے غیر افسانوی صنف میں ہوتا ہے۔ اردو نثر میں سفر نامے کی روایت خاصی قدیم بھی ہے۔ انسان فطری طور پر تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ وہ یکسانیت سے ادب جاتا ہے۔ نئی باتیں اور نئی چیزیں دیکھنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی فطرت انسان کو سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔

اگر سفر کرنے والا شخص ذوق لطیف کا مالک ہو تو پھر وہ سفر کے حالات و واقعات کو ضبط تحریر میں بھی لے آتا ہے۔ ہم ادب کی زبان میں سفر نامہ کہتے ہیں۔

فنی لحاظ سے سفر نامے کا کوئی اسلوب یا تکنیک ابھی تک وضع نہیں کیا گیا ہے۔ یہ سفر نامہ نگار کی تخلیقی صلاحیت اور ادبی ذوق پر منحصر ہے کہ وہ سفر نامہ کے لیے کون سی ہیئت اور اسلوب متعین کرتا ہے۔ یعنی فن کے معاملے میں سفر نامہ نگار بہت حد تک آزاد ہوتا ہے۔ وہ جس اسلوب میں چاہے سفر نامہ تحریر کرے۔ وہ سفر نامہ لکھنے کے دوران اس بات کا خیال رکھے کہ سفر نامہ، سفر نامہ رہے، داستان یا ناول یا افسانہ نہ بن جائے۔ اس میں پراسراریت اور دل چسپی بڑھانے کے لیے غیر ضروری رنگین بیانی، کہانی پن یا واقعہ میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اردو نثر کے سرمایے میں سفر ناموں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔



ابن انشا

ابن انشا کا اصل نام شیر محمد خان تھا۔ اردو ادب کی دنیا میں ابن انشا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابن انشا کی پیدائش ہندوستانی پنجاب کے ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں ایک کاشتکار خاندان میں 1927ء میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام منشی خان تھا جو پھلوں کا گڑ کے بڑے کاشتکار تھے۔ ابن انشا کی والدہ بی بی مریم ایک گھریلو اور دین دار خاتون تھیں۔

ابن انشا نے اپنے گاؤں کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر 15 سال کی عمر میں اپرہ ہائی اسکول سے 1942ء میں میٹرک پاس کیا۔ مادری زبان اردو تھی لیکن فارسی زبان سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انشا نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ شاعری میں ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک شاعر ہونے کے علاوہ ابن انشا ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ اردو نثر میں ان کا ایک ضخیم سفر نامہ شائع ہو کر اہل علم سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔

والدہ کی شدید خواہش پر 1942ء میں ابن انشا کی شادی ایک شہری لڑکی عزیزہ بی بی سے ہوئی۔ شادی کے بعد ابن انشا تلاش معاش اور مزید تعلیم کی غرض سے لاہور چلے گئے۔ جہاں ان کو علماء، شعرا اور ادباء کا وسیع ماحول میسر ہوا جو ان کی شخصیت میں نکھار اور باضابطہ ادبی زندگی کے آغاز کا باعث ہوا۔ قیام لاہور کے دوران ابن انشا کی ملاقات غلام رسول مہر، عبدالعجید سالک، مولانا صلاح الدین اور مشہور شاعر حفیظ جالندھری جیسی شخصیات سے رہی جن کی صحبتوں نے ابن انشا کی زندگی میں مزید نکھار پیدا کیا۔ اس زمانے میں ابن انشا کالج میں پڑھتے بھی تھے اور اخبار ’نوائے وقت‘ میں جزیقی کام بھی کرتے تھے۔ اس طرح گردش حالات کا شکار ہو کر ابن انشا لاہور سے واپس آ گئے اور اہمالہ چھاؤنی میں ملٹری اکاؤنٹس کے شعبے میں جو نیر کلرک کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ اور ترقی کر کے کراچی میں نیشنل بک کاؤنسل کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ ملازمت کے دوران بھی ابن انشا نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور ادبی مشاغل یعنی لکھنے پڑھنے میں بھی مصروف رہے یہاں تک کہ ایک سفر نامہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک مستقل شاخت قائم کی۔

1977ء میں ابن انشا ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ علاج کے لیے لندن لے جایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا اور 2 جنوری

1978ء کو لندن میں ہی انہوں نے دائمی اہل کو لبیک کہا۔

فلپائن کا سفر۔ ۱۹۶۷ء

اگر کسی مسافر کی کوئی نقدی یا کوئی اور قیمتی چیز یا دستاویزات وغیرہ ہوٹل کے کمرے سے گم ہو جائیں تو ہوٹل ملکا قطعی ذمہ دار نہ ہوگا۔ مہمانان عزیز کو خبردار کیا جاتا ہے کہ خواہ چند لمحوں کے لیے بھی کمرے سے باہر جائیں کمرے میں کوئی قیمتی چیز نہ چھوڑیں اور دروازہ مقفل کر کے باہر نکلیں۔ رات کو کمرے میں سوتے وقت دروازے کی دوہری چٹنیاں بھی ضرور چڑھالیں۔

ہوٹل ملکا کسی مسافر کے کمرے میں صنف مخالف کے کسی رکن کا آنا مستحسن نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی معزز مہمان کمرے کے پیرے یا ہوٹل کے اسٹاف کے کسی اور رکن سے مل ملا کر کچھ کر لے تو ہوٹل خود کو بری الذمہ سمجھے گا۔

’ہم اپنے مہمان عزیز کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ایسی خدمت کریں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ یہ اس ہوٹل کے کمرے میں لٹکے ہوئے نوٹس کی نقل مطابق اصل ہے ہر چند کہ یہ ہوٹل یہاں کے قابل اعتبار ترین اور معزز ہوٹلوں میں گنا جاتا ہے تاہم مہمان کے جان و مال کی سلامتی کی گارنٹی دینا دوراندیشی کے خلاف سمجھتا ہے۔ لہذا اس وقت بھی جب کہ رات کے گیارہ بجے ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں کمرے کی نہ صرف دونوں چٹنیاں لگی ہوئی ہیں بلکہ ہم نے لکھنے کی میز دروازے سے بھڑا کر اپنا سوٹ کیس اس پر رکھ دیا ہے۔ شام کے چھٹ پنے کے وقت کھڑکی کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا تھا۔ ہم نے کھڑکی کھول کر موصوف سے کہا کہ اے جان قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج؟ بولا ’آپ کی کھڑکی کے شیشے صاف کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے کہا۔ ’کر لو۔ لیکن صرف شیشے صاف کرنا۔ بولا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔ پھر کسی وقت آکر کر لوں گا۔ روم بوائے سے ہم نے فوجی ہی کہہ دیا تھا کہ کھانا کھا چکے، چائے ہم پی چکے۔ اب ہم آرام کریں گے۔ تم بھی آرام کرو۔ پھر بھی دوبار دروازہ کھٹکھا کر پوچھ چکا ہے کہ اور کوئی خدمت؟ سوچنے کی بات ہے کہ ٹیلیا ہوٹل والے غریب الوطن مسافروں کے آرام و آسائش کے بارے میں کتنے فکر مند رہتے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔ کابل کے ہوٹل روم کا بوائے تو ایسا استغنا کا مارا ہوا تھا کہ آواز دینے پر بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے پوچھ لیا تھا کہ صاحب کب اور کس روز جاییں گے۔ بس اس روز وقت نکال کر

بخشش لینے ضرور آگیا۔

جب بھی ہم کہیں کا سفر اختیار کرتے ہیں لوگ طرح طرح کے بہانوں سے ہمیں باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کابل کے معاملے میں ہمیں سردی سے ڈرایا گیا تھا۔ نیلا کے بارے میں سردی کا عذر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ یہاں بارہ مہینے گرمی رہتی ہے۔ لہذا چوری چکاری کا ذکر لے بیٹھے۔ کراچی میں ہمارے ایک جرمن دوست ہیں، اکثر سفر کرتے رہتے ہیں، ہم نے ان سے آشرवाद چاہی تو بولے: 'نیلا۔؟' میاں اخبار پڑھا ہے؟ اس وقت جرائم کے معاملے میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔ سائیکلون اور نیو یارک سے بھی۔

’جی پڑھا ہے۔‘

’پھر مت جاؤ۔‘

’جانا ضروری ہے۔‘

’وہاں چوری ضرور ہوتی ہے۔ جیب ضرور کٹتی ہے۔ اپنے ساتھ کوئی رقم رقم لے کر مت جانا۔‘

’جی اچھا۔‘

’ٹیکسی والے بہت بد معاش ہیں۔ ایرپورٹ سے ٹیکسی میں بیٹھو تو راستے میں گھما کر ہوٹل کی بجائے کسی ویران علاقے میں لے جاتے ہیں۔ مسافر کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں اور سوٹ کیس لے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لہذا اپنے ساتھ سوٹ کیس لے کر نہ جانا۔‘

’جی بہت مناسب۔‘

’میرے ایک دوست کے تو انھوں نے کپڑے بھی اتار لیے تھے۔‘

’تو کیا کپڑے بھی نہ پہن کر جاؤں۔‘

’بولے۔‘ یہ میں نہیں کہتا۔ ہاں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ وہاں کسی کی آبرو محفوظ نہیں۔ اقوام متحدہ کے دفتر کی ایک میم صاحب وہاں تنہا گئی تھیں۔.....‘

’ہم نے کہا۔‘ جس قسم کی آبرو کا آپ حوالے دے رہے ہیں۔ اس کا ہمارے معاملے پر اطلاق نہیں ہوتا۔‘

’مصر ہو کر کہنے لگے۔‘ میں پھر کہتا ہوں کہ مت جاؤ۔‘

’ضرور جائیں گے۔‘ ہم نے کہا۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ فرنگی آدمی ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ کسی ایشیائی سے شروٹو

ہوں، کسی قسم کا تعلق قائم کریں جائز اور ناجائز کی بحث تو بعد میں آتی ہے۔

یہ اچھا ہے کہ میرے فلپائنی دوست بنی بابو کو میرا خط مل گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی فرلانگ بھرلی کار لے کر ہمیں لینے غیلا ایر پورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ ایک اور بزرگ بھی ایک بین الاقوامی ادارے کی طرف سے ہماری پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ یہ قوم کے بھارتی تھے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بولے۔ 'تو اچھا اپنے دوست کے ساتھ جارہے ہیں آپ، ٹھیک ہے۔ فلاں ہوٹل میں آپ کا بندوبست ہے، تھوڑا مہنگا ہے لیکن نسبتاً محفوظ ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اقوام متحدہ کے کام سے آئے ہیں۔ تھوڑی سی رعایت بھی شاید کر دیں۔'

لفظ و معنی

متفعل	-	تالا لگا ہوا
صنف	-	قسم
رکن	-	ممبر
مستحسن	-	اچھا
معزز	-	عزت والا
بری الذمہ	-	ذمہ داری سے آزاد ہونا
قابل اعتبار	-	بھروسہ کے قابل
تاہم	-	پھر بھی
دوراندیشی	-	دور تک سوچنا
موصوف	-	جس کی صفت بیان کی گئی ہو
روم بوائے	-	ہوٹل کا خدمت گار
غریب الوطن	-	اپنے وطن سے دور رہنے والا
جزائے خیر	-	اچھا بدلہ
استغنا	-	بے نیازی
قباحت	-	پریشانی
اطلاق ہونا	-	لاگو ہونا
مصر ہونا	-	بھند ہونا



شیر و شکر ہونا ۔ مل جل کر رہنا

آپ نے پڑھا

□ ابن انشا نے فلیلا (فلپائن) کا جو سفر نامہ لکھا ہے اس کا ایک حصہ آپ نے گذشتہ صفحات میں پڑھا۔ انشا نے بتایا کہ کس طرح لوگوں نے انہیں اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور وہاں کے خطرات سے آگاہ کیا۔ جب کہ ایسی کوئی خاص بات نہ تھی۔ تھوڑا بہت سلامتی کا مسئلہ تو ہر نئے ملک میں سیاح کے لیے ہوتا ہی ہے۔

آپ بتائیے

1. ابن انشا کی پیدائش کب ہوئی؟
2. ابن انشا کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟
3. زیر نصاب مضمون کے قلم کار کون ہیں؟
4. ابن انشا کا اصل نام کیا ہے؟
5. فلپائن کی راجدھانی کہاں ہے؟

مختصر گفتگو

1. سفر نامہ کی مختصر تعریف بیان کیجیے۔
2. ابن انشا کی مختصر سوانح بیان کیجیے۔
3. فلیلا کے بارے میں پانچ جملے لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

1. ابن انشا کے سفر ناموں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. زیر نصاب سفر نامہ کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

آپ کے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اردو سفر ناموں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. گلوب کو سامنے رکھ کر فلپائن کے جغرافیائی حالات معلوم کیجیے۔

خودنوشت

خودنوشت سوانح حیات (Auto biography) سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی تصویر خود بناتا ہے۔ انسانی تقاضے کے تحت اس کا غیر ارادی سطح نظر یہی ہوتا ہے کہ لوگ اسے پہچانیں۔ خودنوشت سوانح حیات میں عجز اور اکسار کے خواہ کتنے ہی پروے ڈال دیے جائیں، تکلفات کے پے در پے حلقے کھینچ دیے جائیں لیکن ہر شخص کا سب سے بڑا ہیرو وہ خود ہوتا ہے۔ خالصتاً فطری اعتبار سے خودنوشت سوانح میں اپنی کہانی خود لکھنے کی شرط ہے۔

آپ بیتی (خودنوشت سوانح حیات) کے لیے صفحات کی یا کوئی خاص طریقہ کار کی قید نہیں۔ یہ چند سطروں پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور سینکڑوں صفحات پر بھی محیط ہو سکتا ہے۔ البتہ آپ بیتی عام طور پر نثر میں اپنے حالات کا لکھنا ہے۔

آپ بیتی کے لیے کوئی بندھے نکلے اصول نہیں۔ تاہم تین شرطوں کی احتیاز لازمی ہے:

۱۔ سچائی، ۲۔ شخصیت، ۳۔ فن

اردو میں بہت ساری خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن میں شاد کی کہانی شاد کی ربانی، (شاد عظیم آبادی)، سحر ہونے تک (آغا حشر کاشمیری)، یادوں کی برات (جوش)، اپنی تلاش میں (کلیم الدین احمد)، غبار کارواں (انیس قدوائی)، قصہ بے سمت زندگی کا (دہاب اشرفی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔